# سفرنامہ

## (علمی، ادبی، ثقافتی اور تاریخی)

کلیدی الفاظ: # سفرنامہ # علمی وادبی # ثقافتی # تاریخی

محمد محتشم

شعبہ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

**تلخیص:**

اس سفرنامہ میں متعدد عنوان پر بحث کی گئیں ہیں جن میں ایک غلط فہمی کا ازالہ، ممبئ میل سے ایک سفر گیا کا، ہمارا شاندار استقبال، ولیمہ کا کھانا، بودھ گیا اور راجا سید ارتھ، مقام مقدس پر کھلم کھلا پامالی، ایک خوشگوار واقعہ، تحفے میں دو قسم کے پھل لانا، حقوق کی ادائیگی ہم سے بہتر بھلا کون جانے، ٹکلٹ کے اقسام ہیں، نان کھٹائی کی خرید اور بسکٹ کا ملنا؛ اللہ سلامت رکھے، وقت فراق آہی گیا وغیرہ ان تمام عناوین پر علمی، ادبی ثقافتی اور تاریخی گفتگو پر مبنی ہیں۔

--------

**مانجھی کی سنگلاخ وادیوں سے ہوتے ہوئے راجا سدھارتھ کی نگری چلیں:** 10 مارچ بروز دو شنبہ اپنے دیرینہ ساتھی عزیزِ گرامیِ وقار حافظ وقاری مفتی محمد داؤد علی مصباحی گیاوی کی دعوت ولیمہ میں شریک ہونے کی غرض سے اپنے رفیقِ تدریس محمد عمران رضوی استاد مدرسہ حنفیہ رضویہ، نارکلڈانگہ کے ساتھ ممبئ میل کے ذریعے رات کے ساڑھے گیارہ بجے ہوڑہ اسٹیشن سے روانہ ہوا۔

گیا جانے کی خواہش مدتِ دراز سے دل کے کسی ایک گوشے میں مچل رہی تھی لیکن وہ مناسب موقع میسر ہو نہیں پا رہا تھا جو ہماری خواہش کی دہلیز پر دستک دے کر ہاتھوں کی آہنی

بیڑیوں کوتوڑتے ہوئے پیروں کی زنجیر سے رہائی دلا کر آگے کی منزلیں آسان کردے۔آخر کار سالوں کی شدید خواہش بڑی مشکل سے محترم کی دعوتِ ولیمہ کی شکل میں پوری ہونے والی تھی۔ میں نے اس دعوتِ ولیمہ کوغنیمت جانا اور اپنی امیدوں کے پرواز کو ہوا کے نازک دوش پر سوار کر کے شہرِ گیا کی خلوص آگیں شمعِ محبت میں خود کو جلا کر فنا کر دینے کے ارادے سے روانہ ہوا؟

**ایک غلط فہمی کا ازالہ:** محض آپ کی غلط فہمی کے ازالے اور تحدیثِ نعمت کے طور پہ یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ اس خاکسار کو موصوف کی طرف سے بارات کی بھی دعوت عنایت ہوئی تھی لیکن دوسری اہم ذمہ داریوں اور بُعد مسافت کے پیشِ نظر محض دعوتِ ولیمہ میں شریک ہونے کا ان سے وعدہ کیا؛ کیوں کہ میری دلی خواہش تو یہ تھی کہ دشرتھ کی خودساختہ راہوں پہ چل کر ان کے سرد احساسات وجذبات اور راہوں میں بکھرے ان کے خونی آنسوؤں کی حرارت کو محسوس کر سکوں، پیر منصور کے فیض رسا مزار پہ جا کر فاتحہ پڑھ سکوں اور گوتم بدھ کے منبعِ حکمت ودانش پہ حاضری دے کر اپنے خزانۂ معلومات میں بیش بہا اضافہ کر سکوں۔اور یہ ساری چیزیں اسی وقت ممکن ہوسکتی تھیں جب کہ دعوتِ ولیمہ کا پرتپاک انداز میں خیر مقدم کروں اور بارات کی رنگین شب کو خوشی خوشی خدا حافظ کہوں؛ اس لیے کہ دولھے کے خوابوں کی شہزادی گوتم بدھ کی نگری شہرِ گیا میں نہیں بلکہ کوئلے کی راجدھانی شہرِ دھنباد میں بستی تھی۔

**ممبئی میل سے ایک سفر گیا کا ہاں:** تو میں عرض کر رہا تھا کہ ممبئی میل کے ذریعہ ہمارا سفر رات کے گھپ اندھیرے میں ہوڑہ سے شروع ہو کر بادِ نسیم کے روح افزا جھونکوں سے باتیں کرتا ہوا شہرِ گیا پہنچ کر اختتام پذیر ہوا پھر منزلِ دل آویز سے سالوں سے مجروح روح کو شاد کرنے، چشمِ بینا کو نوشۂ وقت کے دیدار سے جلا بخشنے اور عقلِ نادان کو درسِ حکمت ودانش پڑھانے کے لیے گاؤں کی نمکین مٹی کو بوسا دینا، آنکھوں سے لگانا اور مشامِ جاں تک لے جانا ضروری تھا، لہٰذا گاؤں کی بھینی بھینی ہواؤں سے قلب وجگر کو معمور کرنے کے لیے سب سے پہلے ہم نے اوٹو کا سہارا لیا پھر بس کے پہیے پکڑیں اور آخر میں بائیک پر سوار ٹھوکریں کھاتا ہوا مجنوں کے درِ دولت پہ نیم مردہ اور پراگندہ حالت میں پہنچیں۔

**ہمارا شاندار استقبال:** نوشۂ وقت اور ان کے خویش واقارب نے ہمارا

شاندار استقبال کیا، ہماری راحت ورأفت کا مکمل خیال رکھتے ہوئے ہمارے لیے ایک کمرہ خاص کر دیا تاکہ ایک پرسکون فضا میں کھل کر ہم سانس لے سکیں اور ساتھ ہی بغیر کسی روک ٹوک کے تزکیۂ قلوب، تطہیرِ نفوس اور تسکینِ عقول کا سامان فراہم کر سکیں۔

بنفس نفیس نوشۂ وقت خود ہماری ضیافت اور دلجوئی کے لیے ہمہ وقت حاضر رہیں اور ہماری خواہشات کا احترام کرتے ہوئے ہماری تمام تر ضروریات کی انجام دہی میں مکمل طور پہ کوشاں رہیں۔

**آفتاب کی بے بسی اور ماہتاب کی خندہ زنی:** شام کا وقت تھا، سورج غروب کی چوکھٹ پر اجازت طلب کرتا ہوا کھڑا آنے والے مہمانوں کو حسرت بھری نگاہ سے مسلسل دیکھے جا رہا تھا۔ اس دل فریب اور حسین شام کا حصہ نہ بن پانے کی وجہ سے خود کو بری طرح کوستا اور قمرِ منیر کی قسمت پر رشک کرتا نظر آ رہا تھا۔ جہاں ایک طرف حسرت ویاس کا آفتاب پچھّم کی اُور تیزی سے ڈوب رہا تھا تو وہیں دوسری طرف امید وبیم کا ماہتاب افقِ آسماں پہ طلوع ہو رہا تھا یعنی ابھی شفق کی سرخی کے شرق وغرب میں پھیلے ہوئے کچھ ہی دیر گزرے تھے کہ رفیقِ محترم مولانا عبد الماجد مصباحی اور رفیقِ درسِ نظامی مولانا غلام محمد رضا مصباحی کی آمد آمد ہوئی۔ ہم سب نے مل کر ان کا پرزور خیر مقدم کیا۔ ان کے تازہ دم ہونے کے بعد دورانِ چائے نوشی وبسکٹ خوری ہم نے حساس وغیر حساس قسم کے مختلف موضوعات پر کافی دیر تک آپس میں تبادلۂ خیالات کیا اور ساتھ ہی دھول پڑی ماضی کی روشن کتاب کے سنہرے اوراق کو پلٹ پلٹ کر الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور، اعظم گڑھ، یوپی میں گزارے ہوئے اپنے خوشگوار پلوں اور یادگار لمحوں کو تازہ کر کے ایک بار پھر سے اسی انداز میں ہم نے تھوڑی دیر جینے کی سعیِ حاصل کیں اور بالآخر ماضی سے کچھ یادگار پلوں اور ناقابلِ فراموش لمحوں کو خوشی خوشی چرالانے میں کامیاب ہوئے۔

**ولیمہ کا کھانا:** آخر وہ گھڑی آ ہی گئی جس کے لیے ہم نے مسافتِ بعیدہ کا سفر برداشت کیا تھا، جس کے لیے ہم نے "السفر کالسقر" کی مشقتیں خندہ زنی سے گوارا کی تھیں یعنی اب ہم سبھی احباب کھانے کی میز پر بیٹھے لذیذ پکوانوں کے آنے کا بے صبری سے انتظار کر رہے تھے اور یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ آخر گاؤں کے کھانے میں ایسی کون سی بات ہے جو بڑے بڑے شہروں میں

عیش وعشرت بھری زندگی گزار رہے افراد کو بھی اپنی سنسان، بیابان اور اندھیر نگری کی اُور کھینچنے پر مجبور کر دیتی ہے اور ہر کوئی اس بات کی آرزو اپنے دل کے کسی گوشے میں ضرور سمائے رکھتا ہے کہ اے کاش! اسے بھی اپنی زندگی میں کم از کم ایک بار گاؤں کی مٹی کی خوش بو محسوس کرنے اور اس سے اپنے خاکی وجود کو معطر و مطہر کرنے کا سنہرا موقع مل جائے۔

ہاں! تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ کھانے کی میز پر ہم بیٹھے تلذذ آمیز غذاؤں کا انتظار کر رہے تھے کہ زرق برق دستر خوان بچھائے گئے، ہاتھ دھلائے گئے، پلیٹیں حسنِ سلیقہ سے ترتیب وار ہمارے سامنے رکھی گئیں، گرم گرم طبعِ نازک کو جلا بخشنے والی ملائم کچوڑیاں اور ذائقہ دار مرغ مسالہ ہماری پلیٹوں میں اس خوب صورتی سے پروسا گیا گویا وہ مرغِ بے جان کے چھوٹے چھوٹے مسالوں کا عطر بیز تنہ چڑھائے ہم سے کہہ رہے ہوں کہ ارے شہری پیٹ کے بچاریو! اب کس مہ جبیں کی آمد کی راہ تک رہے ہو، ادھر ادھر تاکنا چھوڑو، تسمیہ پڑھو اور بھوکے بھیڑیوں کی طرح ہم مرغِ بے جاں پہ ٹوٹ پڑو۔

خیر! ہم نے ان کے اس پکار کا بصد خلوص احترام کیا اور ان پر اس طرح بن موسم کی برسات کی طرح برسے کہ ان کے ہم جنس پڑوسی ہم سے پناہ مانگنے لگے۔ دوسری طرف اپنی باری کے منتظر سروں پہ کراماً کاتبین کی طرح سوار تماشا بیں حضرات ہمارے طریقۂ تناول کو دیکھ کر حیرت کے مارے ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرنے لگے کہ انھیں دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شہری مہمان بہت دنوں سے بھوکے پیاسے در بہ در کی خاک چھانتے پھر رہے تھے اور آج مال مفت کے بے تحاشا اور بے روک ٹوک ملنے پر دلِ بے رحم کا مظاہرہ کرنے پر اتر آئے ہیں۔ اگر یہی صورت حال کچھ دیر اور برقرار رہی تو ممکن ہے کہ ہمارے حصے میں سوائے ہڈی کے کچھ بھی نہ آئے۔

خیر! جب ہم نے ان بے زبان و بے بس مرغِ مسلم سے اپنا دوزخ تقریباً بھر لیا تو اپنی دوزخ کے کچھ بچے کھچے حصے کو بھرنے کے لیے ہم نے بطورِ ایندھن بریانی اور زردے کو کام میں لایا اور حلق کے آخری سرے تک اچھی طرح بھر کر اپنی نشست سے جب ہم اٹھیں تو ایسا لگا کہ زمین اچانک بڑھنے والی ہماری گرانی سے کانپتی ہوئی لاحول ولاقوۃ الا باللہ کا ورد کرنے لگی ہے یا ہم نے کوئی ایسا محاذ سر کر لیا ہے جس کی ہمیں تو کیا، غیروں تک کو بھی توقع نہ تھی۔

**رفیقِ سفر عمران رضوی کا اصرارِ شدید اور محفلِ سماع:** کھانے سے فارغ ہوا تو ہمارا یہ بوجھل بدن جواب دے چکا تھا، چلنے پھرنے کی بالکل بھی ہمارے اندر سکت باقی نہ رہ گئی تھی، بسترِ استراحت پر جا کر خوابِ خرگوش کے مزے لینے کے لیے میرا جسمِ ناتواں بے قرار تھا اور میری نرم طبیعت بھی اس بات کی بالکل اجازت نہیں دے رہی تھی کہ کوئی اور جنگ جیتنے کے لیے ہتھیار بند ہو کر دشمنوں کے نرغے میں گھس کر تباہی مچائی جائے لیکن قربان جاؤں شریکِ سفر محمد عمران رضوی کے شوقِ طفلانہ پہ کہ موصوف محفلِ سماع میں شریک ہونے کے لیے بہت پر جوش اور ضد پہ اڑے تھے۔ لہٰذا ان کے شوق کی تکمیل کے لیے پاس ہی کے ایک گاؤں میں ہو رہے محفلِ سماع میں اس غرض سے حاضر ہوا کہ وہاں ہونے والے خرافات ولغویات اور غیر شرعی امور کا بچشمِ خود مشاہدہ کر کے سادہ لوح مسلمانوں کو ان جیسے نام نہاد صوفیوں کے دامِ مکر وفریب سے بچانے اور ان سے نپٹنے کے طریقوں پہ غور کیا جا سکے۔ لہٰذا اس رازِ پنہاں سے پردہ اٹھانے کے لیے محبِ گرامی محمد فرقان مصباحی یہ خانقاہ جہاں قوالی کی محفل جمی ہوئی تھی، انھیں کا علاقہ ہے۔ محترم نے اپنا اچھا خاصا وقت ہماری آؤ بھگت میں صرف کیا۔ اللہ تعالیٰ انھیں نظرِ بد سے ہمیشہ محفوظ رکھے اور ان کے وجود سے ہر کس وناکس عمومی طور پہ مستفید ومستفیض ہوتے رہے۔

**محمد کاشف ایان:** یہ نوشا کے بھانجے تھے، یہ ہمہ وقت ہمارے ساتھ ساتھ رہیں اور مہمان نوازی کا مکمل حق ادا کر دیا اور دلچسپ بات تو یہ ہے کہ قرب وجوار کے علاقے انھیں کی وجہ سے دیکھنا ممکن ہوا۔ اللہ تعالیٰ انھیں بھی تا ابد اپنے حفظ وامان میں رکھے۔

اور دیگر احباب کے ساتھ روانہ ہوئے۔ وہاں جو رقص وسرور کی رنگا رنگ محفلیں اور صنفِ نازک کی چہل قدمیاں دیکھیں وہ بیان سے باہر ہے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ اس خانقاہ کے سجادہ نشین اور روحِ رواں کوئی اور نہیں بلکہ ہمارے علاقے سے متصل ایک محلہ فارسی بگان میں رہنے والے ایک نام نہاد صوفی ملک شبیر احمد ہیں۔

**تحفہ میں میں نے کیا دیا، تمھیں کیوں بتاؤں؟** خیر وہاں سے لوٹ کر ہم سبھوں نے دولھے کی خدمت میں تحفے تحائف پیش کیے اور الوداعی سلام پیش کرنے کے بعد سونے کے ارادے سے اپنے اپنے بستروں پہ تھکے ماندے بوجھل جسموں کے ساتھ دراز ہو گئے؛ کیوں کہ نوشہ وقت

اپنی شریکِ حیات اوران کے اہلِ خاندان کے ہم راہ صبح سویرے ہی ان کے وطنِ عزیز روانہ ہونے والے تھے۔

لہذا دوسری صبح ہم نے بھی اس علاقے کو چھوڑ کر رفیقِ درس کی مسجد جو کہ گیا اسٹیشن سے بالکل قریب کریم گنج میں تھی، میں ٹھہرنا زیادہ پسند کیا؛ کیوں کہ شہرِ گیا سے وہ علاقہ جہاں ابھی ہم ٹھہرے ہوئے تھے یعنی رگھوا چوک تقریباً ۵ کیلومیٹر کی دوری پہ تھا اور اسی رات ۱۱ بجے کی ہماری ٹرین بھی تھی اور موصوف کے گاؤں میں رہ کر تاریخی مقامات کا دورہ کرنا پھر تازہ دم ہو کر اسٹیشن پہنچنا بہت ہی مشکل امر تھا، اس لیے اپنے احبابِ سفر کے ہم راہ صبح ۸ بجے کے قریب پہاڑ پور اسٹیشن سے انٹرسٹی ٹرین کے ذریعہ سوے منزل روانہ ہوا اور تقریباً ایک گھنٹے کے مختصر سفر کے بعد رفیقِ محترم مولانا غلام محمد رضا مصباحی کی رفاقت میں ان کی مسجد (جو کہ زیب النسا کے نام سے موسوم ہے اور اسی مسجد میں اسحاقیہ کے نام سے ایک مدرسہ بھی قائم ہے جس میں وہ بحیثیتِ مدرس تعلیمی فرائض انجام دے رہے ہیں۔) پہنچا۔ غسل وغیرہ کی فراغت کے بعد موصوف نے ناشتے کا انتظام کیا۔ ناشتے میں روٹی، سبزی اور گرما گرم جلیبیاں تھیں جنہیں کھا کر دل خوش ہو گیا۔

**بودھ گیا اور راجہ سدھارتھ:** ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر رفیقِ سفر محترم محمد عمران رضوی کے ساتھ اس مقام کی سیر کے لیے نکلا جہاں راجہ سدھارتھ نے اپنی پوری سلطنت اور زندگی بھر کے عیش و آرام کو ہمیشہ کے لیے تج کر کے پناہ لی تھی اور برگد کے ایک درخت کے نیچے پرماتما کی یاد میں دنیا و مافیہا سے خود کو بے نیاز و برطرف کر کے گیان کی پراپتی کے لیے مراقبے میں بیٹھے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ اسی درخت کے نیچے ۶۲۳ عیسوی کے قریب تین ہفتے کے مکمل و مسلسل دھیان کے بعد راجہ سدھارتھ کو حکمت و دانش کی لازوال دولت ملی اور وہ سدھارتھ سے گوتم بدھ بن گئے۔ پھر رفتہ رفتہ ان کے پرستاروں اور ارادتمندوں کا حلقہ وسیع تر ہونے لگا اور اتنا وسیع تر ہوا کہ ان کے چاہنے والوں نے اس مقام پہ جہاں انھیں گیان پراپت ہوا تھا، ایک عالی شان مندر تعمیر دی۔

**ہاں! وہ درخت اسی نسل سے ہے:** یہ موجودہ درخت وہ درخت نہیں ہے جس کے نیچے بیٹھنے کی وجہ سے گوتم بدھ کو علم و دانش کی گراں قدر دولت ملی تھی۔

کہا جاتا ہے کہ پہلے والے درخت کو اس کی بیوی نے، دوسرے کو بدھ مذہب کے سخت مخالف بنگال کے ایک راجہ نے کٹوا دیا تھا اور تیسرا درخت طوفان و آندھی کی وجہ سے تباہ و برباد ہو گیا تھا۔

موجودہ درخت جو اسی کی نسل سے ہے، پڑوسی ملک سری لنکا جہاں ان کے پیروکاروں کی ایک بڑی تعداد رہائش پذیر ہے، سے لایا گیا ہے۔ وہاں سے دو درخت لائے گئے تھے۔ دوسرا درخت سارناتھ میں لگایا گیا ہے۔

یہ درخت جو ابھی بودھ گیا میں گوتم بدھ کی مندر کے صحن میں ہے، وہ چند آہنی ستون کے سہارے ایستادہ ہے۔ نیز درخت کے چاروں طرف بڑی بڑی لوہے کی دیواریں ہیں تاکہ درخت لوگوں کی آمد و رفت اور زمینی و آسمانی آفات و بلیات سے محفوظ رہیں۔ درخت سے گرنے والے پتوں کو زائرینِ گوتم بطورِ تبرک جمع کر کے گھر لے جاتے ہیں۔ انہیں امن و شانتی کی علامت اور حکمت و دانائی کا مصدر تصور کرتے ہوئے اپنے گھروں میں رکھتے اور بطورِ شفا انھیں استعمال کرتے ہیں۔ خاص مندر کے اندر غالباً سونے کا پانی چڑھا ہوا گوتم بدھ کا ایک بہت بڑا مجسمہ ہے اور اس کے چاروں طرف پرشاد کے پھل پھول، خالص پانی کی بوتلیں اور رنگ و روغن کی شیشیاں ترتیب وار رکھی ہوئی ہیں نیز جگہ جگہ مندر کے دیگر انتظامات کی انجام دہی کے لیے بڑے سلیقے سے خیراتی صندوقیں بھی رکھی ہوئی ہیں تاکہ لوگ حسبِ حیثیت اپنے جیبِ خاص سے تعاون پیش کر کے مندر کے تعمیراتی اور انتظامی امور میں حصہ لے کر انتظامیہ کی مدد کر سکیں۔

اسی احاطے میں ایک بہت بڑا تالاب بھی ہے جس میں گوتم بدھ حصولِ طہارت و نظافت کے لیے غسل کیا کرتے تھے۔

**ایک دیا گھر بھی:** اس حوالے سے میں نے وہاں موجود ایک خاتون پولیس اہل کار سے معلومات حاصل کیں تو پتہ چلا کہ یہاں ہر روز تقریباً ایک لاکھ دیے جلائے جاتے ہیں اور یہ دیے تیل کے ذریعے روشن کیے جاتے ہیں نہ کہ گھی کے ذریعے۔ آپ شب و روز کے کسی بھی حصے چلے جائیں، کم از کم ایک نہ ایک دیا آپ کو ضرور روشن اور اپنے وجود کو مٹاتا ملے گا۔ میں نے مزید اس حوالے سے تفتیشات کیں تو معلوم ہوا کہ یہ بعد کی پیداوار ہے۔ گوتم بدھ کے ماننے والوں نے اس

دیے گھر کی تعمیر اس مقصد سے کی تھی کہ وہ یہاں دیا روشن کر کے اپنی من و کامنا اور دلی خواہشات پوری کر سکیں۔

جب خاتون پولیس اہل کار نے یہ سب کچھ بتا کر ایک لمبی آہِ سرد لی تو ازراہِ مذاق ایک قدم آگے بڑھ کر میں یہ پوچھ بیٹھا کہ کیا آپ نے بھی کبھی اپنی دیرینہ خواہشات پوری کرنے کے لیے یہاں پہ دیا جلایا ہے؟ تو اس نے مسکراتے ہوئے بس اتنا جواب دیا کہ ہمیں اس کی کیا ضرورت ہے؟ ہمارے پاس تو بھگوان کے کرپا سے سب کچھ ہیں، لیکن میں بھی اپنی طبیعت سے مجبور اور وہ بھی اس وقت جب کہ سامنے کوئی خوب صورت، جاذبِ نظر، دل نشین دوشیزہ ہو؟ میں نے آگے بڑھ کر کہا کہ جہاں تک میرا خیال ہے، آپ کو تو دیا روشن کرنے کی دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ضرورت ہے تاکہ آپ کی ترقی کی راہیں مزید ہموار ہو جائیں اور آپ اپنے پسندیدہ عہدے تک رسائی حاصل کر کے ایک خوشگوار اور مسرت آگیں زندگی گزار سکیں، لیکن لوگوں کی ہماری طرف اٹھنے والی دزدیدہ نگاہوں سے بچنے کے لیے بس اتنا کہہ کر اس نے خاموشی اختیار کر لی کہ ہاں! میں بھی ضرور اب دیا روشن کروں گی۔ خواہش تو حل من مزید کہہ رہی تھی لیکن اس کی معذرت کے آگے مجبور ہو کر میں نے بھی سلسلۂ کلام کو وہیں پہ منقطع کیا اور سوغاتِ محبت پیش کرتے ہوئے اس امید کے ساتھ آگے بڑھ گیا کہ زندگی نے وفا کی تو پھر ملاقات ہوگی۔

**مقامِ مقدس کی کھلم کھلا پامالی:** جب میں کچھ آگے بڑھا تو میری نظر اچانک باغ کے ایک گوشۂ تنہائی میں بیٹھے ایک دوسرے کی بانہوں میں ہاتھ ڈالے بوس و کنار میں مگن ایک نوجوان جوڑے پر پڑی۔ انھیں اس جگہ لوگوں کے درمیان اس حالت میں دیکھ کر بہت حیرت ہوئی اور دل نے کہا کہ یہ تو ان کا مقامِ مقدس ہے، یہ تو اس کی حرمت و تقدس کے پاسبان اور اس کی صحت کے امین ہیں لیکن افسوس کہ ان کا حال یہ ہے کہ یہ خود اپنی نازیبا اور ناشائستہ حرکتوں سے اس کی پامالی اور بے قدری میں لگے ہوئے ہیں۔

**داخلہ ممنوع ہے:** خیر! ان کی تعلیم و تربیت پہ اظہارِ افسوس کرتا ہوا وہاں سے آگے بڑھا اور ایک ایسے خوب صورت، کشادہ باغ کے دروازے پہ جا پہنچا جہاں جلی حرفوں میں لکھا ہوا تھا ''اگر آپ اس باغ کی سیر و تفریح سے لطف اندوز ہونا یا یہاں باغ میں موجود نوع بہ نوع کے رنگ

برنگے پھولوں کی خوشبوؤں سے مشامِ جاں کو معطر کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو زیادہ نہیں بس ۲۰ روپے بطورِ اجازت طلبی دینے پڑیں گے لیکن اگر آپ ان چیزوں کے ساتھ ساتھ اس بات کے بھی خواہشمند ہیں کہ آپ کو گوتم بدھ جیسا پر سکون ماحول ملے تا کہ آپ بھی ان کی طرح خدا کا قرب قریب سے حاصل کر کے اس کے برگزیدہ بندوں میں شامل ہو سکیں یا پھر گیان پراپت کر کے گوتم بدھ جیسی وشال زندگی گزار سکیں تو زیادہ نہیں بس ۲۰ روپے بطورِ سند آپ کو خرچ کرنے پڑیں گے۔

جب میں نے یہ دیکھا تو سب سے پہلے جو بات میرے ذہن وخیال میں آئی وہ یہ تھی کہ حسن وجمال اور نقش ونگار میں اس سے بیش بہا باغات تو خود ہمارے شہر کولکاتا میں موجود ہیں اور رہا سوال مراقبے کا تو یہ اپنے گھروں میں بھی رہ کر آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔اس کے لیے بلاوجہ محنت سے کمائی ہوئی گاڑھی رقم برباد کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ ان کے علاوہ سب سے اہم بات یہ کہ ہمارے موبائل فونز فی الحال ہماری دستِ قدرت سے باہر تھے۔ ہوا یوں کہ دورانِ دخول غاصبانہ طور پہ ناعاقبت اندیش لوگوں نے ہمارے موبائل فونز پر یہ کہہ کر اپنا قبضہ جمالیا کہ انھیں اندر لے جانے کی اجازت نہیں ہے، لہذا انھیں یہیں رکھ دیں اور وقتِ خروج آپ کی امانت جن کا آپ نے ہمیں نہ چاہتے ہوئے متحمل بنایا ہے، سونپ دیا جائے گا۔

لہذا ہم نے بھی باغ کے اندر جانے کا فیصلہ یہ سوچ کر ترک کر دیا کہ جب ہم ان خوب صورت مناظر اور دل افروز لمحات کو اپنی خوبصورتی کا زیور بنا ہی نہیں سکتے تو پھر اندر جانے سے کیا فائدہ؟ لہذا ہم وہیں پہ تھوڑی دیر کھڑے کھڑے اس کی در ودیوار میں بسی خوشبوؤں اور جانفزا اندرونی مناظر سے قلب وجگر کو شاد کام کر کے آگے کی طرف بڑھ گئے۔

**سب کچھ بالکل مفت:** آپ کو بتا تا چلوں کہ دیارِ گوتم بدھ میں یہ واحد ایسی جگہ تھی جس کی سیر وتفریح کے لیے آپ کو Entrance Fee Pay کرنا پڑتا ہے ورنہ اس کے علاوہ مندر کے کسی بھی حصے میں چلے جائیں خواہ وہ مقامِ رفعِ حاجات ہو یا دیارِ گوتم بدھ سے آنکھوں کو محظوظ کرنے کے لیے مختص مقاماتِ مقدسہ ہوں یا سامانوں کی حفاظت کے لیے بنائے گئے حفاظتی

کمرے ہوں، الغرض کہیں بھی چلے جائیں آپ کو کچھ بھی بطورِ ضمانت ادا کرنا نہیں پڑے گا۔

**کیمرہ لے جانا ہرگز نہ بھولیں:** دوسری بات یہ کہ اگر آپ تصویر کشی کے شوقین ہیں، اگر آپ تاریخی عمارات اور خوب صورت مقامات کو تصویروں میں قید کرنے کے خواہشمند ہیں تو پھر اپنے ساتھ کیمرہ لے جانا ہرگز بھی نہ بھولیں۔ نہیں تو آپ کو میری طرح ذہن میں محفوظ یادوں کے سہارے کام چلانا پڑے گا بشرطِ کہ آپ کی یاداشت بھی میری ہی طرح مضبوط ہو۔ ہاں! اگر آپ کے پاس کیمرہ نہیں ہے اور نہ ہی آپ کے اندر کیمرہ خریدنے کی استطاعت ہے تو فکر کرنے یا ناحق پریشان ہونے کی بالکل بھی ضرورت نہیں ہے؛ کیوں کہ گوتم بدھ سے دلی عقیدت رکھنے والے بھکشوؤں کو آپ کی بے بسی، بے کسی اور غربتی کی پہلے سے ہی خبر تھی، اسی لیے انھوں نے آپ کے مہنگے ترین موبائل فونز کو (ضائع یا چوری ہونے کے خوف سے) اپنی حراست میں لے لیا اور کاغذ کے کچھ ٹکڑوں کے بدلے آپ کے ہاتھوں میں اپنا سستا کیمرہ پکڑا دیا تاکہ شوق سے تصویر کشی کرتے ہوئے دندناتے پھریں۔

تو یہ مژدۂ جانفزا سن کر آپ سبھی خوش ہو جائیں، اظہارِ خوشی کے طور پر صدقات و خیرات کریں اور ہم جیسے سفر کے ماروں کو اپنے سفرناموں میں یاد رکھیں۔

**ہمارے پاس بھی پرمان ہے:** وقت کا پہیہ بڑی تیزی سے کھسک رہا تھا، اس لیے فوراً مندر کے احاطے سے باہر نکل کر اپنے اپنے موبائل فونز ہم نے ان کے قبضے سے آزاد کرایا اور آس پاس کی چند دلکش جگہوں کی تصویریں اس مقصد سے اپنے اپنے کیمرے میں قید کرنا شروع کر دیں کہ کل کہیں ایسا نہ ہو کہ مخالفینِ گوتم بدھ کی طرح ہمارے بھی مخالفین یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوں کہ تمھیں کبھی راجہ سدھارتھ کی نگری پہ قدم رکھنے، دیارِ گوتم کی در و دیوار کو ہاتھوں سے لمس کرنے اور چشمِ بینا سے دیکھنے کا سنہرا موقع ملا ہی نہیں تو پھر تم کیسے اس بات کا دعوا کر سکتے ہو کہ میں نے نہ صرف دیارِ گوتم کو قریب سے دیکھا بلکہ دیارِ گوتم میں ہو رہی چہل پہل کو بھی محسوس کیا؟ تو اس وقت

ایسے کم ظرف اور شکی لوگوں کو بطورِ پرمان کیمرے میں قید چند یادگار تصویریں دکھا کر اپنا سر ان کے سامنے فخر سے بلند اور ان کے سرغیروں کے سامنے شرم سے جھکا سکوں۔

**قبرستان بھی ہے اور جامع مسجد بھی:** داخلے کے دروازے سے بائیں طرف تھوڑے فاصلے پہ ایک مسلم قبرستان بھی ہے۔ ہم نے اندر جا کر صدیوں سے اپنی اپنی قبروں میں لیٹے مفلوک الحال، نیکی کے بھوکے بوسیدہ جسموں سے مل کر ان کے حال احوال جاننے اور ان کی دادرسی کرنی چاہی لیکن پھر یہ سوچ کر رک گئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ بن بلائے آنے کی پاداش میں ملک الموت سے ہماری مڈبھیڑ ہو جائے اور ہمارے دراز دامن کو پکڑ کر یہ کہنا شروع نہ کر دیں کہ اے سدھارتھ کے دیوانو! یہاں کیسے آنا ہوا؟ یہ سدھارتھ کی نگری نہیں جہاں داخلہ ممنوع ہو بلکہ یہ ہماری لامحدود سرحد ہے اور یہاں نہ زمان کی کوئی قید ہے اور نہ مکان کی کوئی کمی ہے۔ ہم بن بلائے آنے والے مہمانوں کا دل کھول کر استقبال کرتے ہیں اور بابِ خروج پہ سنہرے حروف سے" خارجہ ممنوع" کا ایک تختۂ نوشتہ نصب کرا دیتے ہیں۔

اسی قبرستان کے مختلف سمت میں تھوڑی سی مسافت پر ایک عالی شان جامع مسجد پورے آب و تاب کے ساتھ سدھارتھ کی نگری میں قدم رکھنے والے دیوانوں کو مذہبِ اسلام کی تبلیغ، نمازِ پنجگانہ کی تلقین اور غازیانِ اسلام کے ذریعے ماضی میں انجام دیے گئے ان کی شاندار تاریخ کی یاد دلاتی ہے لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے لاکھ چاہنے کے باوجود مسجد میں جا کر نہ سجدہ ریز ہو سکیں اور نہ ہی اپنے شکستہ سجدوں سے مسجد کی در و دیوار کو مضبوط اور میناروں کو روشن و بلند کر سکیں۔

**ایک خوشگوار واقعہ** : اب ہم چاروں طرف بڑی تیزی سے تاکتے جھانکتے مندر کے صحن سے باہر نکل آئیں۔ پیاس سے ہمارے حلق خشک ہوئے جا رہے تھے، زبانیں سوکھ کر پتھریلی زمین میں تبدیل ہو چکی تھیں، آوازیں بہ مشکل حالتِ زار کی ترجمانی کر پا رہی تھیں، اس لیے رفیقِ سفر نے بڑی مشکل سے ہاتھوں کے اشارے سے مافی الضمیر کی ادائیگی کرتے ہوئے دو گلاس بہترین شکنجی بنانے کی درخواست کی۔ ایک طفلِ مکتب کی طرح ہمارے حکم کی بجا آوری کرتے

ہوئے دکاندار اپنے کام میں مشغول ہو گیا اور میں میز پر بیٹھا اطراف واکناف کے خس وخاشاک، بازار کی رونقیں، مختلف نظریات ومذاہب کے حامل افراد کی چہل پہل، رنگ برنگے پھولوں اور شبنمی قطروں کی دید میں مگن تھا کہ ایک ایسا خوب صورت واقعہ پیش آیا جس نے حسن کے متلاشی میری تعاقبی نگاہ کو ہندوستان کی موجودہ صورتِ حال کے پیشِ نظر یہ فیصلہ لینے پر مجبور کر دیا کہ واقعی اب بھی لوگوں میں جذبۂ انسانیت باقی اور بیدار ہے، واقعی اب بھی لوگ پہلی جیسی چین وسکون اور محبت وخلوص سے بھرپور زندگی گزارنے کے خواہشمند ہیں لیکن چند زر پرست اور گنگا جمنی تہذیب کی دھجیاں اڑانے والے چند شر پسند عناصر ہر جگہ موجود ہیں جو کبھی بھی یہ نہیں چاہتے کہ ہندوستانی عوام اتحاد واتفاق کی مضبوط رسی ہاتھوں میں تھامے امن وشانتی والی زندگی بسر کریں بلکہ وہ ہمیشہ اس بات کے لیے کوشاں رہتے ہیں کہ کس طرح اپنی نفرتی بیان بازیوں اور زہریلی تقریروں کے ذریعے ہندوستانی آب وہوا کو مکدر اور ان کی آپسی شیرازہ بندیوں کو منتشر کیا جا سکے۔

بات دراصل یہ ہے کہ Juice Maker کی دکان کے پاس میز پر بیٹھا قدرت کی حسین ودلکش تخلیقات کو دیکھ کر رشک کیے جا رہا تھا کہ ایک بوڑھی عورت اپنے دونوں پاؤں کی چپلوں کے سہارے چلتی ہوئی دکان کے پاس آئی اور پانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شدتِ عطش کا بے صبری سے اظہار کیا۔ دکاندار نے اس کی ہیئت کذائی پر ترس کھاتے ہوئے پانی سے لبریز جگ اس کی طرف بڑھا کر پانی پینے کا اشارہ کیا لیکن وہ نیم مردہ عورت بجائے جگ سے پانی پینے کے اپنی تھیلی میں سے ایک چھوٹا سا پیالہ نکال کر دھونے اور دھونے کے بعد میری طرف پھینکنے ہی والی تھی کہ اس دکاندار نے کہا کہ ارے اماں جی! یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟ آپ دیکھتی نہیں کہ مولانا صاحب (یقین سے نہیں معلوم کہ حقیقت میں کس لفظ سے اس نے مجھے مخاطب کیا تھا) یہاں براجمان ہیں اور وہ نماز وغیرہ پڑھتے ہیں۔ اس کی زبان سے تیر کی طرح بے ساختہ نکلے یہ الفاظ سن کر مجھے بے انتہا خوشی ہوئی اور دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ یہ شخص جو کہ ایک ہندو ہے، ہماری طہارت ونظافت کا اسے کتنا خیال ہے اور ایک ہم ہیں جنھیں نہ تو ٹھیک سے طہارت کے اصول معلوم ہیں اور نہ ہی نظافت کا اس قدر شدومد کے ساتھ اہتمام کرتے ہیں۔

ربِ قدیر سے میری دلی عریضہ ہے کہ اس راہیِ گم شدہ کے دل کو رشد وہدایت کی

طرف پھیر دے اور اپنی غلامی میں شامل فرمالے۔

**تحفے میں دو قسم کے پھل لایا:** اب ہم فوراً سدھارتھ کی نگری کی طرف حسرت بھری ایک آخری نگاہ ڈال کر مسجد کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں احباب کے لیے پھلوں کی ٹوکری لے کر مسجد تیزی سے پہنچیں۔ رات کے کھانے میں بریانی اور دیگر لوازمات ہماری منتظر تھیں، ہم نے یہ پسند نہیں کیا کہ مزید انتظار کی دہلیز پہ چشم وسر بچھائے چشم براہ کو کھڑا رکھا جائے اور شکم بھی مزید اپنے شکمِ نازک پہ سنگِ انتظار باندھے رکھنا نہیں چاہتا تھا لیکن میں نے اسے اپنی طرف مخاطب کر کے بڑے پیار سے کہا کہ محترم! تمہاری کیفیت کا مجھے بخوبی علم ہے مگر جب اتنی دیر رک ہی گئے ہو تو تھوڑا اور سہی تا کہ میں نماز سے فارغ ہو جاؤں اور پھر تیرے سنگ تنہائی میں بیٹھ کر طرح طرح کے ذائقہ دار پکوانیں مزے لے لے کر کھاؤں اور بھوک و پیاس کی شدت مٹاؤں۔ کھانا واقعی لذیذ تھا۔ کھا کر صبح سے ناخوش چل رہی ہماری طبیعت مسرور اور روحِ مضمحل پر سکون ہو گئی۔

اللہ رب العزت ہمارے عزیز مولانا غلام محمد رضا کو ہمیشہ اس مسجد کا پیشِ امام عزت و احترام کے ساتھ بنائے رکھے تا کہ جب کبھی ہم جیسے سفر کے مارے اس شہرِ غریب بہ اعتبارِ دلِ رئیس کا رخ کریں تو یہ موصوف کشادہ قلبی اور خندہ پیشانی کے ساتھ ہماری راہوں میں گل پاشی کرتے کھڑے رہیں اور اس سے بہتر انداز میں ہماری خدمت کر کے اپنی دوستی کا حق ادا اور ہم جیسے لٹیروں سے اپنی عزت کا تحفظ کریں۔

**حقوق کی ادائیگی ہم سے بہتر بھلا کون جانے؟** عصر کا وقت قریب تھا، آنکھوں میں نیند کا خمار تھا، جسم درد سے چور تھا اور بسترِ خوابِ شیریں حسرت سے میری طرف نظریں جمائے ملتجی تھا۔ خواہش تو تھی کہ اس کی طرف نظرِ وصالِ شوق نہ کروں لیکن بندۂ عاجز کی بلند طبیعت میں انکساری، محبت، خلوص، پاسِ ادب اور ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اور ہمیں تو تدریسِ اخلاق کے ساتھ ساتھ تہذیبِ اخلاق کا بھی سختی سے حکم کیا گیا تھا تو پھر بھلا یہ کیسے ہو سکتا

تھا کہ انگشتِ شہادت پہ بھیگی بلی کی طرح نچانے والی بیویوں کے ناجائز حقوق تو خوشی خوشی پورے کروں (لیکن بھلا کون، ان کے جائز حقوق بھی پوری کرتا ہے؟) مگر غمِ تنہائی میں دست و باز و کا ایک آخری سہارا بننے والے بے زباں بسترِ مخملی کو فراموش کر کے گوشۂ تنہائی میں ڈال دوں۔

لہٰذا میں نے فوراً اس کی طرف التفاتِ محبت کی اور اس کے سارے حقوق بجالاتے ہوئے اس پر دراز ہو کر اسے ان کے برابر لا کھڑا کر دیا۔ ابھی دراز ہوئے کچھ ہی وقت گزرے تھے کہ مؤذن نے اپنی پیاری اور خوب صورت آواز میں صدائے حق دی اور ہم سبھی بسترِ راحت و سرور کو چھوڑ کر خالق و رازق سے ملاقات کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔

**دیارِ شوق میں مے کدوں اور پروانوں کی کوئی کمی نہیں:** نماز سے جوں ہی فارغ ہوئے تو عزیز القدر محمد ثناء المصطفیٰ (جو کہ ابھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم ہیں اور یہیں انگریزی ادب میں گریجویشن کر رہے ہیں۔ ان سے میری پہلی ملاقات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہی میں ہوئی تھی اور سچ کہوں تو ان سے پہلی ملاقات سالوں پہلے الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور میں ہو چکی تھی۔ وہ اس طرح کے ان کے بڑے بھائی مفتی محمد عطاء المصطفیٰ مصباحی گیاوی ہمارے زمانے ہی میں الجامعۃ الاشرفیہ میں زیرِ تعلیم تھے، ان سے میرے اچھے تعلقات ہیں۔ آپ اگر ان دونوں بھائیوں کو آمنے سامنے رکھ کر دیکھیں تو بہت مشکل سے دونوں میں فرق کر پائیں گے؛ کیوں کہ دونوں شکل و صورت اور بول چال میں کافی حد تک ایک دوسرے سے مشابہت رکھتے ہیں اور ان کے والدِ محترم حافظ و قاری مولانا محمد تبارک حسین صاحب قبلہ مدظلہ العالی بہت ہی ملنسار اور علما نواز ہیں۔ موصوف پیر منصور نامی مسجد کے پیش امام اور اس میں قائم مدرسہ کے صدر المدرسین ہیں۔ حضرت کو جیسے ہی ہماری آمد کی خبر ملی تو بڑے شوق سے اپنے گھر پہ ہمیں مدعو کیا، ہماری خیر و خبر دریافت کی اور اپنے گھر پہ ہمارے لیے رات کے کھانے کا اہتمام کیا۔) کی کال آئی اور دیارِ شوق میں آنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ ان کی پر خلوص محبت کو ٹھکرانا میرے بس میں نہیں تھا، اس لیے ان کی دعوتِ محبت پر لبیک کہتا ہوا اپنے شریکِ کارواں محمد عمران رضوی اور محمد عبد الماجد مصباحی کے ساتھ ان

کے آشیانے پہ جا پہنچا۔ سلام وکلام کے غیر معمولی تسلسل کے بعد ہماری خدمت میں ناشتہ پیش کیا گیا لیکن کچھ کھانے پینے کی اشتہا نہ تھی؛ کیوں کہ کچھ دیر پہلے ہی ہم کھانے سے فارغ ہوئے تھے، اس لیے ہم نے ان سے معذرت کر کے رات میں حساب وکتاب چکتا کرنے کا عزمِ مصمم کیا اور پھر محمد ثناء المصطفیٰ کے ساتھ کچھ خاص مقامات کی سیر وتفریح کے لیے نکل پڑیں۔

**مسلمانوں کی کل آبادی پورے شہر میں صرف ۲۰ فی صد ہیں:** پورے راستے موصوف سے یہاں کی آب و ہوا، تہذیب وتمدن اور موجودہ حالات کے تناظر میں ہندو مسلم یک جہتی، بھائی چارگی، آپسی معاملات، لین دین اور ان کی کل آبادی کو لے کر تبادلہ خیال کرتا رہا۔ موصوف نے بتایا کہ یہاں ہندوؤں کی کل آبادی تقریباً ۸۰ فی صد ہیں اور یہاں علاقوں کی زیادہ تر تقسیم کسی ایک Community کے افراد اور ان کی تعداد کو ملحوظِ خاطر رکھ کر کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات اور کشاکشی جیسی صورتِ حال نہ کہ برابر یہاں دیکھنے کو ملتی ہے۔ کثیر آبادی والے علاقے میں مسلمان آزادی سے بڑے جانوروں کی خرید وفروخت کرتے ہیں اور انھیں اپنے دسترخوان کی زینت بنا کر مندوبین کی مہمان نوازی کرتے ہیں۔ خود میں نے اپنی آنکھوں سے قصاب بستی جیسا ماحول کریم گنج میں دیکھا کہ یہاں لوگ کھلے طور پہ گوشت کی خرید وفروخت کر رہے ہیں۔

مجموعی طور پہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ شہر امن وشانتی کا گہوارہ ہے اور لوگ صدیوں سے اپنے پرکھوں کی روش کو برقرار رکھتے ہوئے ایک خوش حال اور بے خوف وخطر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ **روضۂ پیر منصور پہ حاضری اور شہر گیا کی معروف خوردنی شے تِلکُٹ کی خریداری!**

اب میں پیر منصور کے آستانے سے متصل مسجد میں نمازِ مغرب کی ادائیگی کے لیے باوضو ہو کر قبلہ رو کھڑا تھا اور دنیا جہاں کی ساری پریشانیوں اور دکھوں کا بوجھ ذہن ودماغ سے اتار کر خشوع وخضوع کے ساتھ اس کی طرف لَو لگائے محوِ عبادت تھا۔ نماز سے فراغت کے بعد محبِ گرامی محمد ثناء المصطفیٰ کے ساتھ Scooty پر سوار ہو کر حدیث رسولِ کریم ﷺ ”جب تم گھر کی طرف واپس جاؤ، تو خالی ہاتھ مت جاؤ بلکہ اپنے ساتھ تحفے تحائف لے کر ضرور جاؤ، چہ جائے کہ پتھر کے چند

ٹکڑے ہی کیوں نہ ہوں؟" کو گلے کی تعویذ بنا کر شہر گیا کی معروف چیز" تلکٹ" خریدنے کے لیے نکلا۔

دوسری بات یہ کہ میری شروع سے یہ عادت رہی ہے کہ جب کبھی کسی نئے شہر میں جانے کا اتفاق ہوتا ہے تو وہاں کی معروف شے خریدنا نہیں بھولتا ہوں اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہماری ماں، بہنیں، چھوٹے چھوٹے بھائی اور والد محترم جو کہ وقتی طور پہ کسی وجہ سے شہر کی چار دیواری منہدم نہیں کر پاتے، ان کے لیے کچھ ایسی چیزیں لیتا چلوں جو انھیں زندگی بھر کی تھوڑی بہت خوشی فراہم کر دیں۔

**تلکٹ کے بھی اقسام ہیں:** یہ دو طرح کی ہوتی ہیں: ایک سفید جس میں مٹھاس کے لیے شکر کا استعمال ہوتا ہے اور دوسری چاکلیٹی جس میں مٹھاس کے لیے گر کا استعمال کیا جاتا ہے۔ دوسری قسم پہلی والی سے قیمت کے اعتبار سے تھوڑی مہنگی اور ذائقہ کے اعتبار سے بہت لذیذ ہوتی ہے۔ میں نے دونوں چکھیں اور گھر والوں کے لیے دونوں میں سے تھوڑا بہت لیا۔ ان کے علاوہ وہاں من کو للچانے والی کھانے کی دوسری چیزیں بھی بڑی تعداد میں موجود تھیں لیکن ساری چیزیں خریدنا تھوڑا مشکل تھا مگر سب سے لطف اندوز ہونا بالکل بھی مشکل نہ تھا، اس لیے میں نے دو مزید چیزیں اس لیے چکھیں کہ ان کے اندر دودھ سے تیار کھووے اور خشک میووں کا خزانہ وافر مقدار میں موجود تھا۔ اس شے کا نام تو یاد نہیں رہا لیکن ذائقہ ایسا تھا کہ کھا کر دلِ غمگین مسرور اور روحِ بے سکون باغ باغ ہو گئی۔

**نان کھٹائی کی خرید اور بسکٹ کا ملنا:** تلکٹ کے علاوہ میں نے اپنے گھر والوں کے لیے نان کھٹائی بھی خریدی۔ یہ دیکھنے میں جتنی زیادہ دلکش تھی کھانے میں اس سے بھی زیادہ ذائقہ دار۔ جس دکان سے ہم نے یہ سامانِ خوردنی خریدی تھیں، اسی دکان کے مالک نے ہماری تہذیب و ثقافت، حسنِ اخلاق، طرزِ کلام اور اندازِ گفتگو سے حد درجہ متاثر ہو کر ہمیں بسکٹ کا تحفہ پیش کیا جسے

کھاتے ہوئے ہم شہر گیا کے ایک معروف مال CITY CENTRE. R. P.A پہنچیں۔ DR FISH سے اپنے پیروں کا علاج کرایا، برقیاتی صوفے پہ بیٹھ کر پورے بدن کا مساج کرایا پھر چند دلکش اور خوب صورت مقامات پر مختلف انداز میں Photos shoot کرا کے پیادہ پا موصوفِ گرامی کے گھر پہنچیں، ہلکا پھلکا ہم نے ناشتا کیا اور سیدھے مسجد کی طرف روانہ ہوئے تا کہ اسبابِ سفر لے سکیں۔

لہذا مسجد پہنچ کر سب سے پہلے تو ہم نے نمازِ عشا ادا کیں، گرما گرم امرتیا کھائیں، حساب و کتاب بے باق کیے اور پھر ہم سبھی شاداں و فرحاں ایک آخری بار پھر سے موصوف کے گھر پہ اتریں تا کہ رات کا کھانا کھانے کے بعد وہیں سے اسٹیشن کے لیے روانہ ہو جائیں۔

**اللہ سلامت رکھے:** بتادوں کہ رات کے کھانے کا انتظام محمد ثناء المصطفیٰ کے گھر پہ تھا۔ ماشاءاللہ! کھانے کا بہت عمدہ انتظام تھا۔ کھانے میں بڑے کی بریانی، سلاد، چٹنی، پاپڑ اور اچار تھے۔ کھانا بہت ذائقہ دار تھا۔ یہ سب کچھ موصوف کی والدۂ محترمہ نے خود اپنے ہاتھوں سے ہمارے لیے خصوصی طور پہ تیار کیا تھا۔ (اللہ تعالیٰ ان کی عمر میں برکتیں عطا فرمائے اور ان کے ہاتھوں کو ہمیشہ صحیح و سلامت رکھے تا کہ پھر ہمیں مستقبلِ قریب میں ان کے ہاتھوں کے بنے مختلف قسم کے لذیذ پکوانیں کھانے کو مل سکے۔) بوقتِ رخصت موصوف کے والد محترم نے بڑے صاحب زادے مفتی عطاء المصطفیٰ مصباحی کی ترجمہ و تخریج کی ہوئی کتاب ہمیں بطورِ تحفہ عنایت فرمائی۔

(دعا ہے کہ مصنفِ کتاب آنے والے دنوں میں اور بھی لازوال تصنیفی کاموں کے ذریعہ خدماتِ اسلام کا فریضہ بحسن و خوبی انجام دیتا رہے۔)

**وقت فراق آ ہی گیا:** اب آخر وہ گھڑی آ گئی جب ہمیں اپنے مخلص احباب کو الوداع کہہ کر لوٹنا تھا۔ احباب کچھ دور تو دست و بازو بنے ہمارے ہم سفر رہیں پھر ایک دوسرے سے آخری سلام و کلام اور عرض و معروض کے بعد رفیقِ سفر محمد عمران رضوی کے ساتھ سوے اسٹیشن روانہ ہوا اور وہ

سوے منزل روانہ ہوئے۔ کچھ دیر کے انتظار کے بعد ٹرین اپنے مسافروں کو گرجدار سیٹی کی آوازوں کے ذریعہ خبر دار کرتی ہوئی پلیٹ فارم نمبر ۲ پر رکی، مسافرین تیزی سے اس کی طرف لپکیں، اپنی اپنی سیٹوں پہ قبضہ جمایا اور دراز ہو گئے۔ میں نے بھی قانونِ فطرت پر عمل کرتے ہوئے نم آنکھوں سے شہر گیا میں بتائے ہوئے پچھلے دو دن کے کچھ یادگار لمحوں کو دل و دماغ میں محفوظ کر کے خیر آباد کہتا ہوا اپنی مجوزہ نشست پر جا پہنچا۔

**ہم ہیں راہی پیار کے پھر ملیں گے چلتے چلتے:** رات کے سوا گیارہ بج رہے تھے، نیند سے آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ لہذا وقت ضائع کیے بغیر تھوڑی سی حرکات و سکنات کے بعد خوابوں کی شیریں دنیا میں حوروں اور افسروں سے ملاقاتیں کرتا ہوا جنت کی سیر کرنے لگا۔ بے خبری اور مدہوشی کا یہ عالم تھا کہ جب صبح اچانک آنکھ کھلی تو دیکھتا ہوں کہ گاڑی اسٹیشن پر کھڑی ہے اور ڈبے مسافروں سے خالی ہیں اور پھر وہی شام و سحر کی رونقیں، رنگ و چمن کی باتیں اور ان کے تذکریں ہمارے انتظار میں کھڑی ہیں۔

## MANJHI THE MOUNTAIN MAN

دشرتھ مانجھی کے ذریعے پہاڑوں کو کاٹ کر بنائے گئے راستے پر بھی چلنے کا شدید اشتیاق تھا لیکن قلتِ وقت کی وجہ سے یہ خواہش پوری نہ ہو سکی اور جو کہ اب حسرت و یاس کی مورت بنی شعور و لاشعور کے کسی خانے میں جا کر گوشہ نشین ہو چکی ہے۔ دشرتھ کو The Mountain Man اور غریبوں کا شاہ جہاں کہا جاتا ہے۔ یہ نام اسے فلمساز Ketan Mehta نے دیا تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ اس نے پہاڑوں سے کاٹ کر یہ راستہ اپنی بیوی فلگان دیوی کی جوشِ محبت سے سرشار ہو کر بغیر کسی کی مدد اور حکومتی سہارے کے تن تنہا بنایا تھا۔ معاملہ اصل میں یہ ہے کہ بڑے بڑے پہاڑ شہر کے بیچوں بیچ حائل ہونے کی وجہ سے اس کی بیوی کو بروقت خاطر خواہ طبی سہولیات فراہم نہ ہو سکیں اور وہ مر گئی۔ اس نے اسی کی یاد میں مسلسل ۲۲ سال یعنی ۱۹۶۰ سے ۱۹۸۲ تک بغیر رکے شب و روز کام کیا اور اپنے بلند حوصلے کی بدولت ۷۰ کیلومیٹر کے فاصلے کو ایک کیلومیٹر میں تبدیل کر دیا۔ اب یہ راستہ ۳۶۰ فٹ لمبا اور ۲۵ فٹ گہرا ہے۔ دوسروں کی راہیں آسان اور زندگی

باغ و بہار کرنے والا یہ پہاڑی آدمی ۱۷ اگست ۲۰۰۷ میں ۷۳ سال کی عمر میں ہمیشہ کے لیے ابدی نیند سو گیا۔

یہ اس کا ایسا کارنامہ ہے جس نے بہتوں کی مشکل بھری زندگی بدل کر رکھ دی، جو رہتی دنیا تک باقی رہے گا اور لوگ اس کے احسان تلے ڈبے رہیں گے۔ بلاشبہ یہ اس کی انتھک کاوشوں کا صلہ ہے کہ لوگ آج بہ آسانی اس کے بنائے ہوئے راستے پر چل کر طبی سہولیات اور اپنی دیگر ضروریات پوری کر پا رہے ہیں بلکہ آج خود اس علاقے میں دشرتھ مانجھی کے نام پر ہر قسم کی سہولیات اور جدید ٹکنالوجی سے لیس ایک شاندار ہاسپٹل قائم ہے جہاں ہر شخص کا بغیر کسی قسم کے بھید بھاؤ، ذات پات اور رنگ و نسل کے علاج کیا جا رہا ہے۔

**تجھے نہ دیکھنے کا غم:** ان کے علاوہ بھی بہت سے مقامات جیسے راجگیر، مخدوم بہاری اور مگدھ یونیورسٹی وغیرہ دیکھنے کا شوق بامِ عروج پہ تھا لیکن تنگیِ وقت اس قدر ظالم اور بے وفا نکلی کہ تھوڑی بہت بھی رعایت نہ برتی۔

خیر! اگر زندگی نے دغا نہ دی تو پھر کبھی دل کے سارے ارمان جو آنسوؤں کے راستے بہ چکے ہیں، پورے کی۔